رسائل و مسائل

میڈیا کا مشرف بہ اسلام ہونا

سوال : آج کل میڈیا کے ذریعے قومیں بام عروج تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ میڈیا معاشرے میں ڈش انٹینا' وی سی آر' ٹی وی' انٹرنیٹ' کیبل نیٹ ورک کی صورت میں موجود ہے' اس حوالے سے لوگوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اگر اسلامی حکومت قائم ہو گئی تو میڈیا کے تمام ذرائع فوراً بند کر دیے جائیں گے جس طرح طالبان حکومت نے افغانستان میں بند کیے ہیں۔ مگر کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ میڈیا کو اسلامک میڈیا بنایا جا سکتا ہے۔

میری الجھن یہ ہے کہ آخر میڈیا کو ہم کس طرح اسلامک بنا سکتے ہیں؟ کیا ٹی وی پر مرد نہیں آئیں گے اور اگر آئیں گے تو کیا گھروں کے اندر عورتیں ٹی وی دیکھنے سے اجتناب کریں گی؟

براہ مہربانی میڈیا کو مکمل طور پر اسلامک میڈیا بنانے کے طریق کار پر کچھ روشنی ڈالیے۔

جواب : ۲۱ ویں صدی کے بارے میں بار بار یہ بات کہی جا رہی ہے کہ یہ معلومات کے بسرعت اثرانداز ہونے والی صدی ہے۔ اسی لیے انفارمیشن ٹکنالوجی' انٹرنیٹ اور میڈیا کے انقلاب کو اس صدی کا امتیاز قرار دیا جا رہا ہے۔ آپ نے اپنے سوال میں میڈیا کے ذریعے اقوام کے عروج تک پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا تعلق ان کے اخلاق و کردار' قوانین فطرت کو سمجھنے اور پیروی کرنے' اور وقت اور قوت و محنت کے صحیح استعمال سے ہے۔ اس میں میڈیا کا کردار بلاشبہ اہمیت رکھتا ہے' لیکن تنہا میڈیا یا ذرائع ابلاغ کے ذریعے کوئی قوم ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتی۔ امریکہ یا یورپ میں بیٹھا ہوا ایک شخص اگر صبح و شام سیٹلائٹ کے ذریعے سائنسی ترقی کی کہانی سنتا رہے اور خود کوئی حرکت نہ کرے تو معاشی اور سیاسی طور پر وہ جہاں تھا وہیں رہے گا۔ ہاں' اگر وہ سائنسی ترقیات سے آگاہی کے بعد اپنے ذہن کو استعمال کرتے ہوئے خود کوئی نئی راہ دریافت کرے گا یا کوئی ایجاد کرے گا تو یہ ایجاد اس کی معاشی ترقی کا باعث بن سکتی ہے۔

دوسری بات جو آپ نے سوال میں اٹھائی ہے' اس کا تعلق خود اسلام کے تصور معلومات اور تفریح و

تعلیم سے ہے۔ قرآن کریم نے انسانوں کی اخلاقی جواب دہی کے حوالے سے جو اصول بیان فرمایا ہے اس کا تعلق محض نظری معلومات سے نہیں ہے بلکہ وہ سماعت، بصارت اور فکر کے عملی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۶) یقیناً آنکھ، کان اور دل سب ہی کی بازپرس ہونی ہے۔

گویا ہم جو کچھ سنتے ہیں، جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو نتائج غور و فکر کر کے (فواد) اخذ کرتے ہیں ان سب پر اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کرنی ہوگی۔ یہ آیت مبارکہ دعوت دیتی ہے کہ سماعت (audition)، بصارت (vision) اور فواد (cognition) کا صحیح اخلاقی استعمال کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ یہاں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ سماعت و بصارت کو چھٹی دے کر محض قیاس اور ظن و گمان کو رہنما بنا لیا جائے۔

بصارت کے صحیح استعمال کے لیے ان تمام علوم (sciences) میں کمال حاصل کرنا ہوگا جن کی بنیاد مشاہدے اور تجربے پر ہے۔ ساتھ ہی جو علم کتابی شکل میں پایا جاتا ہے اسے بھی حاصل کرنا ہوگا۔ اسی طرح سماعت کی جواب دہی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صرف ان معلومات کو کانوں کے ذریعے سے دل و دماغ تک پہنچنے دینا ہو گا جو مفید اور اخلاقی ہوں۔ ان دونوں ذرائع علم کو وحی الٰہی (قرآن و سنت) کی روشنی میں دل و دماغ کی تجربہ گاہ (laboratory) میں جانچ پرکھ کر جدید تحقیقات اور تخلیق علم کے عمل کو اختیار کرنا ہو گا۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد ہی ایک شخص سمع و بصر و فواد کی مسئولیت کی ذمہ داری پوری کر سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد سوال کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں۔ میڈیا یا طباعتی اور کہربائی ذرائع ابلاغ پر اس وقت عملاً شیطان کا قبضہ ہے۔ اگر ہمیں عالمی حالات سے واقفیت حاصل کرنی ہو تو سی این این اور بی بی سی کی آنکھوں اور کانوں سے حالات کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔

تفریح کے لیے ہم سرحد پار کی اخلاق دشمن فلموں، گانوں اور عریاں ویڈیو پروگراموں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور خود ہمارا ٹی وی احساس کمتری کا شکار ہونے کے سبب سرحد پار کے پروگراموں کی نقل کو اپنی فن کاری سمجھتا ہے۔ اس صورت حال میں ایک حل تو یہ ہے کہ اگر آپ کے گھر میں ٹی وی یا وی سی آر ہے تو آپ دونوں کو زمین میں دفن کر دیں، اور خود کو یہ سمجھالیں کہ آپ نے میڈیا کے شیطان کے خلاف جہاد کا ثبوت پیش کر دیا ہے۔ لیکن ایسا کرنے کے باوجود آپ کے پڑوس میں ڈش پر وہ سب کچھ آتا رہے گا جس سے بچنے کے لیے آپ نے اپنا ٹی وی اور وی سی آر زمین میں دفن کیا۔ اور خود آپ کے اپنے بچے اور پڑوس کے بچے شیطانی میڈیا سے متاثر ہوتے رہیں گے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ فنی کمال کے ساتھ متبادل پروگرام بنائیں جن میں ڈرامے بھی ہوں، نغمے بھی ہوں، دستاویزی پروگرام بھی ہوں، گویا

تعلیم و تفریح اور معلومات کو تعمیری اور اخلاقی نقطۂ نظر سے ٹی وی اور ریڈیو پر نشر کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں یہ وہ طریقہ ہے جسے قرآن کریم نے یوں کہا ہے کہ "بلاشبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں" (ھود ۱۱:۱۱۴)۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیطانی میڈیا کی جگہ اسلامی میڈیا میں کیا صرف تلاوت قرآن، درس حدیث اور تاریخ اسلامی کے اسباق، قوالیاں اور لمبے لمبے، خشک اور نیند آور تقریریں ہی ہوں گی یا اسلامی میڈیا کے علم بردار فنی طور پر ایسی تخلیقی اور تعمیری دستاویزی فلمیں، ڈرامے اور نغمے پیش کر سکیں گے جو ناظرین اور سامعین کے لیے دل چسپ اور معلوماتی بھی ہوں؟

عملی طور پر بعض مسلم تنظیموں نے اس میدان میں کام کر کے ہمارے لیے بہت سہولت پیدا کر دی ہے۔ ترکی میں رفاہ پارٹی کے زیر اثر نوجوانوں نے کارٹون، تاریخی شخصیات اور اخلاقی موضوعات پر بچوں اور بڑوں کے لیے ایک دو نہیں، بیسیوں ویڈیو پروگرام فنی مہارت کے ساتھ تیار کیے ہیں۔ ان میں سے بعض کو دیگر زبانوں میں dubb بھی کر دیا گیا ہے۔ شکاگو میں Sound Vision نامی ادارے نے بچوں کے لیے دل چسپ پروگرام اور کارٹون ویڈیو پر بنائے ہیں۔ یہ سب فنی لحاظ سے معیاری ہیں۔

یہ بات بھی واضح ہو جانی چاہیے کہ جدید اور کلاسیکی موسیقی کو نظرانداز کر کے اور نیم عریاں خواتین کو ڈراموں اور نعت جیسے پروگراموں میں لائے بغیر بھی دل چسپ اور فنی لحاظ سے معیاری پروگرام بنائے جا سکتے ہیں۔ اسلام نے جہاں اور جس حد تک تفریح کے ذرائع کو جائز قرار دیا ہے اسے بلاوجہ حرام قرار دیے بغیر ان کا استعمال ہو سکتا ہے، مثلاً دف اور ڈھول کے استعمال کی کوئی ممانعت نہیں۔ چھوٹی بچیوں کے مل کر نغمہ گانے کا ذکر حدیث میں موجود ہے۔ اخوان المسلمون مصر نے امام حسن البنا کی قیادت میں ایک پورا شعبہ اسلامی ڈراموں اور نغموں کا بنایا تھا جو پورے عالم عرب میں مقبول ہوا۔ یاد رہے امام البنا کے والد عبدالرحمٰن البنا ایک مشہور محدث، اور امام البنا خود جامعہ الازہر کے فارغ تھے۔ بلاشبہ اسلام لہوالحدیث کو حرام قرار دیتا ہے، موسیقی کی ممانعت کرتا ہے، لیکن اس کے ساتھ آلات موسیقی کے بغیر حسن صوت کی ہمت افزائی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ مؤذن کے تقرر اور قرآن کریم کی تلاوت کے لیے حسن صوت پر زور دیتا ہے۔ حضورؐ، حضرت حسان بن ثابتؓ سے شعر سننا پسند فرماتے تھے۔ اگر توازن اور اعتدال قائم رکھتے ہوئے میڈیا کو اسلامی روایت کے فروغ کے لیے استعمال نہ کیا گیا تو شیطانی ثقافت ہماری نیک خواہشات، اور اس ثقافت کے لیے بددعاؤں کے باوجود ہمارے معاشرے کو تباہ اور ہماری اخلاقی بنیادوں کو متاثر کرتی رہے گی۔

ثقافتی ابلاغ عامہ کی یلغار دور جدید کا ایک حربہ ہے۔ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے۔ اس لیے ہمیں قرآن و سنت کی بنیاد پر اس میدان میں چیلنج قبول کرتے ہوئے جامد روایت پرستی سے آزاد ہو کر اسلامی اخلاق، حیا

اور طہارت کے دائرے میں رہتے ہوئے تجربات کرنے ہوں گے۔ اگر خلوص نیت کے ساتھ ایک وقت اور ضرر کو دور کرنے کے لیے اجتہاد کیا جائے، اور اس میں بالفرض غلطی بھی ہو جائے تو حدیث نبویؐ کی روشنی میں کسی معصیت کا ارتکاب نہیں ہوگا بلکہ ایک اجر ہی مل جائے گا۔ اور اگر یہ اجتہاد، جس کی پوری امید ہے، درست ہو، تو ان شاء اللہ دہرا اجر ملے گا۔

مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کے بعد نہ تو ٹی وی بند ہوگا، نہ ریڈیو بلکہ دونوں مؤثر ذرائع کو اخلاقی، تعمیری اور معلوماتی پروگراموں کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ہمارے علاوہ جن ممالک میں اسلامی نظام لانے کی کوشش کی گئی ہے، مثلاً سوڈان اور ایران، کیا وہاں ٹی وی اور ریڈیو بند کر دیے گئے؟ یہ خیال بھی غلط ہے کہ ٹی وی پر کوئی مرد نظر نہیں آئے گا اور صرف انسانی سائے کام کرتے نظر آیا کریں گے۔ کیا حضور نبی کریمؐ نے سیدہ عائشہؓ کو ایک موقع پر اپنے شانہ مبارک پر سر رکھ کر حبشی کرتب کرنے والوں کے کرتب دیکھنے سے منع فرمایا تھا؟ بلاشبہ اسلام غض بصر کا حکم مردوں اور عورتوں دونوں کو دیتا ہے، لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ خواتین کسی بھی فرد کی طرف بغور نہیں دیکھ سکتیں؟ اگر یہ بات درست ہے تو کوئی خاتون بھی عقلاً کسی مرد کے بارے میں قانونی شہادت کی شرط پوری نہیں کر سکتی۔ ظاہر ہے شہادت کی بنیاد یقینی طور پر مشاہدے پر مبنی ہے۔ اسلام ان انتہاؤں کے درمیان ہے جن میں ہم پھنس کر رہ گئے ہیں۔ کسی مرد کو دیکھنے کے دوران نگاہوں کا اس کے بالوں یا چہرے میں الجھ کر رہ جانا اور اسے اپنا منظور نظر بنا لینا، اس کی تصویر کو اپنے کمرے میں لگانا، اس کے نام پر اپنی اولاد کا نام رکھنا، ان سب خلاف شرع افعال سے مکمل طور پر اجتناب کرتے ہوئے بھی ایک صالح، فطری مگر اخلاقی تصور تفریح میڈیا کے ذریعے سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت نظری گفتگوؤں کی نہیں، عملاً ایسے پروگرام پیش کرنے کی ہے جن کو دیکھنے کے بعد ہمارے انتہائی محتاط فقہا بھی اپنی رائے میں نرمی پیدا کرنے پر آمادہ ہو جائیں (ڈاکٹر انیس احمد)۔

دعوت دین اور رکنیت جماعت

س: میری ایک ملنے والی جماعت اسلامی کی کارکن ہیں۔ انھیں امیدوار رکنیت کا فارم بھی دے دیا گیا ہے اور ان کی ساتھی خواتین بار بار ان سے پوچھتی رہتی ہیں کہ وہ کب امیدوار بنیں گی؟ مگر انھیں فارم پُر کرنے میں کچھ الجھن ہے۔ وہ جماعت کے پروگراموں میں شرکت کرتی ہیں، ماہوار رپورٹ بھی دیتی ہیں۔ اعانتیں جمع کرنا، تنظیمی پروگرام کی ذمہ داری اٹھانا، مہمات میں اپنی استطاعت کے مطابق حصہ لینا جیسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتی ہیں۔ ان کے شوہر جماعت کے

متفق ہیں لیکن اگر ان کے علم میں آجائے کہ دن بھر کی تربیت گاہ ہے، جلسہ ہے، یا کوئی مظاہرہ ہے تو وہ سختی سے منع کر دیتے ہیں کہ ان میں شرکت کی ضرورت نہیں۔ درس قرآن، دعوت دین اور ملاقاتوں کی حد تک تو خواتین کو اجازت ہے مگر فرنٹ پر کام کرنا ضروری نہیں (مذہب اور سیاست الگ والی بات نہیں ہے)۔ اسی طرح کئی دفعہ اس بات پر بھی منع کر چکے ہیں کہ امیدوار یا رکن بننے کی بھی ضرورت نہیں۔

وہ گوشوارہ رکنیت پُر کرنا چاہتی ہیں مگر انھیں اس کی تمام شقوں سے اتفاق نہیں، خاص طور پر آخری شق سے۔ ان کا موقف ہے کہ اس فارم کی شرائط پر چونکہ عمل درآمد مشکل ہے اس لیے یہ دو رخی کی کیفیت اور دو رنگی ہے جو غلط ہے۔ دوسرے جماعت کے کچھ امیدوار اور ارکان جن سے ان کا تعلق رہا ہے، نہ تو وہ کارکن کی طرح جماعت سے مخلص ہیں، نہ ان کا اخلاق اس معیار کا ہے اور نہ وہ اس سرگرمی اور دل جمعی سے کام کرتے ہیں جس طرح ایک کارکن کام کرتا ہے۔ یہ بات بھی باعث عدم اطمینان ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ کسی کے کام سے متفق ہونا، بھرپور حمایت کرنا، تحریکی کاموں میں آگے بڑھ کر عملاً حصہ لینا، اپنی حد تک سمع و اطاعت کا اہتمام کرنا، کیا یہ کسی جماعت سے مخلص ہونا نہیں؟ کیا فارم بھرے بغیر ہم نیکی کا ساتھ نہیں دے سکتے؟ کیا فارم اخلاص کی کسوٹی ہے کہ جو اسے پُر نہ کرے وہ جماعت سے مخلص نہیں؟ ان کے لیے الجھن یہ بھی ہے کہ وہ جماعت کو چھوڑنا نہیں چاہتی ہیں لیکن دوسری طرف وہ شوہر کے دباؤ میں بھی ہیں۔ کیا وہ یہ کام شوہر سے چھپ کر کر سکتی ہیں؟ کیا رکنیت کا فارم پُر کیے بغیر دعوت دین کا کام نہیں ہو سکتا؟

ج: مجھے اس بات پر بے حد خوشی ہے کہ آپ نے ایک عملی مسئلے کا ذکر اپنے خط میں کیا ہے۔ وضاحت کی غرض سے جواب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے کا تعلق امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت دین کے سلسلے میں ایک بیوی یا بیٹی کے لیے حدود اطاعت سے ہے۔ قرآن کریم اور سنت مطہرہ نے اس سلسلے میں واضح اصول یہ دیا ہے کہ اولاً ہر مسلمان مرد اور عورت پر دین کا سمجھنا اور اسے آگے پہنچانا فرض ہے۔ امت مسلمہ کا مقصد قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ "اب دنیا میں وہ بہترین امت تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو" (اٰل عمرٰن ۳:۱۱۰)۔ ساتھ ہی ہمیں یہ اصول بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ جواب دہی کا بوجھ نہیں ڈالتا۔ اور حدیث کی روشنی میں ایک خاتون اپنے گھر اور اپنی اولاد پر اتنی ہی مسئولیت رکھتی ہے جتنی ایک مرد پورے خاندان پر۔ ظاہر ہے یہ مسئولیت اس کے دائرہ

کار اور دیگر وظائف کے حوالے سے ہی ہوگی، مطلق نہیں ہو گی۔ اس لیے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد، ایک خاتون کو اپنے وظائف زوجگی اور فریضہ اقامت دین میں توازن برقرار رکھتے ہوئے یہ دعوتی کام کرنا ہو گا اور ترجیحات کا تعین کرنا ہوگا۔ ہر صورت حال میں غور کرنے کے بعد فیصلہ کرنا ہو گا کہ مقصد دعوت کہاں زیادہ صحیح طور پر حاصل ہو رہا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دعوت دین غیر معمولی طور پر ایک اجتہادی عمل ہے۔ اصول دین اور اصول فقہ کو صحیح طور پر سمجھے بغیر دعوتی کام یا تو ایک میکانکی عمل بن جاتا ہے یا بعض اوقات گھریلو زندگی میں کھچاؤ اور قانونی جنگ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کریم نے شوہر کو اس کے گھر میں سربراہ ہونے کے سبب ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔ اس کی مثال کچھ ایسی ہے کہ ایک کالج یا یونی ورسٹی میں ۱۵ افراد گریڈ ۲۰ کے پروفیسر ہوں، اور ان میں سے ایک کو ادارے کا سربراہ بنا دیا جائے۔ ظاہر ہے اس طرح وہ ۱۹ پروفیسروں سے ایک درجہ افضل ہو جائے گا، لیکن اپنے رفقا اساتذہ کی رائے، مشورہ، تجربہ، ہر چیز سے استفادہ کر کے ہی کوئی فیصلہ کرے گا اور ایک آمر کی طرح تکبر کا شکار نہیں ہو گا۔ جب تک وہ سربراہ ہے، بقیہ اساتذہ اس کی ہر حق بات کی اطاعت کریں گے اور ہر غلط بات پر نصیحت کریں گے۔ اور اگر بات قانون اور عقل کے بالکل منافی ہو تو اطاعت بھی نہیں کریں گے کیونکہ شریعت کا اصول ہے: لاطاعة المخلوق فی معصیة الخالق۔ اس لیے دعوتی مقاصد کے حصول کی اہمیت کو ایمان کی حد تک اہم ماننے کے باوجود، ایک بیوی یا بیٹی کو عموماً اپنے شوہر یا باپ کی جائز ہدایت کو اہمیت دینا ہوگی اور اس وقت تک دینا ہوگی جب تک اس کی ہدایت دین کے واضح اصولوں اور تعلیمات کے منافی نہ ہو۔

حضور نبی کریمؐ نے اسی بنا پر حضرت صفوان ابن معطلؓ کی اہلیہ محترمہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ نماز میں دو دو سورتیں پڑھنے کے بجائے ایک ہی سورت پڑھ لیں، اور نفل روزہ رکھنے میں شوہر کی ضرورت کا خیال رکھیں (ابوداود)۔ گویا قانونی رسہ کشی کی جگہ افہام و تفہیم اور محبت و نرمی اور دل کو ہاتھ میں لے لینے کی حکمت ہی حکمت دعوت ہے۔ جب بھی یہ شکل اختیار کی جائے گی شوہر یا باپ دعوت دین میں کبھی رکاوٹ نہیں بنے گا، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرے گا کہ اس کی بیوی یا بیٹی اپنے وقت، صلاحیت اور صحت کا صحیح استعمال کر رہی ہے اور اس تعاون پر وہ خود بھی اجر عظیم کا مستحق ہو جائے گا کہ اس نے اپنی بیوی کو اپنی ضرورت نظرانداز کر کے دعوت دین جیسی عبادت کرنے سے نہیں روکا۔ ہاں اگر شوہر یا باپ کسی معصیت کا حکم دے تو اس میں اطاعت و تعاون نہیں: ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔

دوسرا اہم پہلو آپ کے سوال میں یہ ہے کہ اگر ایک تحریکی کارکن وہ تمام ذمہ داریاں پوری کر رہی ہے جو ایک امیدوار رکنیت یا رکن سے متوقع ہوتی ہیں، لیکن دستوری طور پر باقاعدہ فارم بھر کر اور باقاعدہ

عہد اٹھا کر رکن بننے سے گریز کرے، تو دین میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ دیکھیے، دین شہادت حق کا نام ہے۔ یہ شہادت قولی بھی ہے اور عملی بھی۔ بغیر کسی معقول سبب کے اس میں تاخیر کرنا اپنے آپ کو اجتماعی برکات سے محروم رکھنا ہے۔ سورہ اٰل عمرٰن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم میں سے ایک جماعت (امت) ایسی ضرور ہونی چاہیے جو امربالمعروف کا کام کرے اور برائی سے روکے (۳:۱۰۴)۔ ایسے ہی اعتصام باللہ کے ذریعے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یک جا ہو کر منظم طور پر ایک نظم کے تحت ہی دین کے قیام کی جدوجہد کی جائے گی (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۳)۔ پھر احادیث نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ جب تین افراد سفر کے لیے چلیں تو ان کو چاہیے کہ اپنا نظام قائم کرلیں اور اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں (ابوداود عن ابوسعید خدریؓ)۔ یہی روایت حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاصؓ سے بھی ملتی ہے۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے فرمایا: "جس طرح بکریوں کا دشمن بھیڑیا ہے اور ریوڑ سے الگ ہو جانے والی بکریوں کا بہ آسانی شکار کرلیتا ہے، اسی طرح شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، اگر جماعت بن کر نہ رہیں (فعليكم بالجماعة والعامة) تو یہ ان کو الگ الگ نہایت آسانی سے شکار کرلیتا ہے"۔ (مسند امام احمد، مشکٰوۃ)۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا "جو شخص جنت کے وسط میں اپنا گھر بنانا چاہتا ہو، اسے جماعت سے چمٹے رہنا چاہیے اس لیے کہ شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے اور جب وہ دو ہو جائیں تو وہ دور ہو جاتا ہے"۔ ان واضح اور مطلق ارشادات داعی اعظمؐ کی موجودگی میں کسی فرد کا ایک مناسب اسلامی تحریک کی موجودگی کے باوجود بغیر کسی عذر کے اس میں باقاعدہ شامل نہ ہونا لازمی طور پر خطرات کا باعث ہوگا۔ اس لیے اسلامی تحریکیں ہم خیال معاشرے کے ہر طبقے کے افراد کو شمولیت کی دعوت دیتی ہیں۔ اس سے صرف وہ لوگ مستثنٰی ہیں جو دلی خواہش، نیت اور کوشش کے باوجود کسی دینی حکمت یا عذر کے سبب شامل نہ ہو سکتے ہوں۔

دینی حکمت میں، میری ناقص رائے میں، وہ شکل بھی شامل ہے جس کا ذکر آپ نے خط میں کیا ہے۔ اگر ایک خاتون ہر لحاظ سے تحریک اسلامی سے وابستہ ہیں لیکن سربراہ خاندان اپنے اس منصب کی بنا پر اسے باضابطہ تحریک میں شمولیت سے روکتا ہے تو اس وقت تک صبر اور انتظار کریں جب تک وہ کشادہ دلی کے ساتھ ایسا کرنے کی اجازت نہ دے دے۔ اس سلسلے میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان بہن کے شوہر کو توفیق عطا فرمائیں کہ وہ اپنی اہلیہ کو اجازت دے کر خود اعلیٰ اجر کے حق دار بن سکیں۔ یہ دعا آپ کو اور ہر تحریکی کارکن کو ایسے مواقع پر ضرور کرنی چاہیے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ دعاؤں کو قبولیت بخشتے ہیں۔

تیسرا اہم پہلو جس کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے وہ اصولی بھی ہے اور عملی بھی۔ اصولی طور پر کسی بھی جماعت بلکہ الجماعت میں بھی یہ کہنا کہ اس کا ہر کارکن، یا رکن، یا ذمہ دار مثالی شخصیت کا حامل

ہوگا، قرآن و سنت کی بصیرت کی روشنی میں درست نہیں۔ بلاشبہ اسلام اور اسلامی تحریک کی جدوجہد کا مقصد ایک مثالی اخلاقی اور اصلاحی معاشرہ اور حکومت کا قیام ہے، لیکن انسانی معاشرے میں انسانی کمزوریوں کا وجود فطری ہے۔ البتہ اس بنا پر نہ تو کمزوری کا جواز تلاش کیا جا سکتا ہے نہ معاف کیا جا سکتا ہے، بلکہ نیکی اور خیر کی تعلیم اور فروغ کے ذریعے صرف کم کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم کے ۲۳ سالہ دور نزول میں جن سزاؤں اور اہل ایمان کی جن اقسام کو بیان کیا گیا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بہترین مثالی معاشرے اور ریاست میں بھی صالح افراد بعض اوقات شیطان کے وساوس میں آسکتے ہیں۔ ان تین صحابہؓ کا واقعہ جو غزوۂ تبوک میں شرکت نہ کر سکے گو وہ صداقت و ایمان کے اعلیٰ مقام پر تھے (التوبۃ ۹: ۱۱۷-۱۱۸)۔ سیدہ عائشہؓ پر بے بنیاد جھوٹ باندھنے کا ذکر قرآن کریم نے خود کیا ہے (النور ۲۴: ۱۱-۲۱)۔ میں مزید واقعات طوالت کے خوف سے ذکر نہیں کر رہا لیکن اس طرف اشارے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی معاشرے میں ۹۹.۹۹۹ فی صد بھلائی ہے اور ۰۰۱. فی صد مواقع پر شیطان کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ معاشرہ اور وہ افراد فائزون میں ہوں گے یا خاسرون میں۔ اب چند لمحات کے لیے غور کیجیے، اپنے تمام تر دعووں کے باوجود کیا تحریکات اسلامی نے اپنے ہر کارکن اور رکن کو تربیت و آزمایش کی اس کٹھن وادی سے گزارا ہے جس سے صحابہ کرامؓ، جن میں سے ہر ایک ہمارے لیے دمکتا ستارہ ہے اور اسوہ حسنہؐ کی مثال ہے، گزرے تھے؟ کیا تحریکات اسلامی کا نظام تربیت اس نظام تربیت کے معیار تک پہنچ گیا ہے جو داعی اعظمؐ نے ہدایت ربانی اور فراست نبویؐ سے خود مرتب فرمایا تھا؟ اس لیے اگر کسی رکن یا ذمہ دار سے کسی کمزوری کا ارتکاب ہو جاتا ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش کریں۔ اسے نہ تو عیب جوئی کا ذریعہ اور موضوع بنائیں، نہ اس بنا پر ہمت ہار بیٹھیں کہ جب ارکان بھی کارکنوں سے پیچھے ہیں تو جماعت میں شمولیت کا کیا فائدہ؟ بالفرض آپ کا مشاہدہ درست بھی ہے تو کیا الدین نصیحۃ والی حدیث سے ارکان جماعت کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے اور کیا صرف امیر جماعت، امیر صوبہ، نائب امرا اور ارکان ہی کا استحقاق ہے کہ وہ دوسروں کو نصیحت کریں۔ حدیث کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ ہر نصیحت امرا، قائدین اور سربراہوں کے لیے بھی ہے۔ اس لیے جب بھی کسی رکن یا ذمہ دار کی کوئی کمزوری علم میں آئے، نصیحت، ہمدردی، خیر خواہی اور اصلاح کے جذبہ کے ساتھ فرد متعلق کو متوجہ کرنا سنت نبویؐ کی رو سے دین ہے اور فریضہ ہے۔

یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ دعوت دین اور اقامت دین میں ہر کام باعث اجر ہے۔ ایک فرد کا اللہ کے دین کی اقامت کے لیے سیاسی مظاہرہ میں حصہ لینا ہو یا قیام اللیل کے دوران تلاوت قرآن، درس حدیث اور نوافل کا اہتمام یا بعض اوقات قیام اللیل میں شرکت کی خواہش کے باوجود ضعیف ماں یا علیل باپ یا بیوی کی تیمارداری کرنے کی بنا پر ایسے پروگرام میں شرکت نہ کر سکنا، ان میں سے ہر ایک کا اجر نصوص سے

ثابت ہے۔ اس لیے اگر ایک شوہر یا باپ کسی معقول وجہ کی بنا پر اپنی بیوی یا بیٹی کو مظاہرے میں جانے سے روکے تو مظاہرہ میں شرکت کی نیت کا اجر تو بہرصورت ملے گا ہی۔ ساتھ ہی کوشش کی جائے کہ شوہر یا باپ کو نرمی و محبت سے اس کام کی اہمیت سے آگاہ کیا جائے۔ دین کی دعوت صبر اور ثبات کے ساتھ کام کرتے رہنے کا نام ہے۔ یہ شرط نہیں ہے کہ ہر خواہش اور ہر فریضہ ایک ہی فرد پورا کرے۔ جتنا بوجھ ایک نفس اٹھا سکتا ہے اور جس کام کو بحسن و خوبی کر سکتا ہے' اسی کے لیے وہ جواب دہی اور اجر کا مستحق ہے۔

جہاں تک سوال کسی فرد کی نیت اور اس کے دل کے حال کا ہے' کسی کے اخلاص کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کے دل کے اندر جھانک کر بچشم خود مشاہدہ ضروری ہے اور میری معلومات کی حد تک ہم میں سے اکثر افراد یہ صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے کسی انسانی کمزوری کی بنا پر generalization یا ایک عمومی رائے قائم کر لینا کہ ایک فرد سے غلطی ہوئی ہے تو سب افراد ہی ایسے ہوں گے' کے بجائے مثبت طور پر مشورہ' نصیحت اور اصلاح کے رویے کو اختیار کرنا دینی حکمت سے زیادہ قریب ہوگا (ا-ا)۔